ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر اقلیمہ ناز

استاد شعبۂ اردو، فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی، راولپنڈی

۹/۱۱ کے تناظر میں اردو افسانے میں نفسیاتی عناصر

The beginning of Twenty-first century is characterized by a rapidly changing situation. The situation created in the context of 9/11 has led to an atmosphere of national and international anarchy and chaos at every level. Terrorism, Target killing and misuse of power lead to psychological disorders like fear, anxiety and insecurity among the people of backward countries. Urdu Afsana has accepted the effects of these psychological disorders directly. This article reflects these psychological elements in the contemporary Urdu short stories.

اکیسویں صدی کا آغاز تیزی سے بدلتے حالات اور نت نئ تبدیلیوں کا شاخسانہ ثابت ہوا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد عالمی سطح پر طاقت کے بے ہنگم استعمال نے تیسری دنیا کے باشندوں کو قبل از وقت خوف اور بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ چنانچہ اس عہد کا ادب بے یقینی، عدم اطمینان اور خوف کی کیفیات سے عبارت ہے۔ اس بے یقینی کا سبب وہ تمام ان ہونے واقعات ہیں جن میں دہشت گردی، لوٹ مار، ملک بدری، عالمی سطح پر امن کو در پیش خدشات اور تیسری دنیا خصوصاً مسلم ممالک کے باشندوں کے حوالے سے عالمی برادری کے تعصبات شامل ہیں۔ یہی وہ عوامل ہیں جو اس عہد کے کرداروں کے ذہنی خلفشار، داخلی بحران، خوف، بے چینی اور عدم اطمینان کا باعث بن رہے ہیں۔ چنانچہ اس عہد کے افسانوں کے کردار اپنی شناخت اور پہچان کے حوالے سے مختلف سوالات کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سوال دراصل ان کرداروں کی داخلی کیفیات کا اظہار ہیں۔

اس عہد کے تقریباً تمام افسانہ نگاروں کے ہاں اپنے عہد کی بے حسی اور تہی دامنی کا احساس خود کلامی کے ذریعے ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ خود کلامی کہیں تو کرداروں کی داخلی رو کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی نظر آتی ہے اور کہیں تحت

لاشعوری کیفیات کے بیان کی صورت میں افسانے کے متن کا حصہ بنتی ہے۔آصف فرخی اس عہد کے اردو افسانے کا ایک اہم حوالہ ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار اس کرب اور تکلیف سے دوچار نظر آتے ہیں۔ان کے کرداروں میں اپنی ساکھ ختم ہونے اور چھن جانے کا دکھ نظر آتا ہے۔

> اب یہ کہنا مشکل ہے کہ نائن الیون نہ ہوا ہوتا تو میں نیو یارک چھوڑتا بھی کہ نہیں۔میں تو شاید چھوڑ بھی دیتا مگر نیو یارک کہاں چھوڑتا ہے۔مگر اس میں میرا دم گھٹنے لگا۔سارے شہر کی ہوا جیسے بند ہو گئی۔۔۔نائن الیون، چاروں طرف نائن الیون، چوبیس گھنٹے نائن الیون، ٹی وی پر، سب وے پر لوگوں کی باتوں میں ،لوگوں کی نظروں اور چہروں پر۔۔۔تب میں نے اپنے شہر کو یاد کیا۔[۱]

یہ کردار دوہری مہاجرت کے کرب سے دوچار ہیں۔پہلی ہجرت پردیس جانے کے لیے کی تھی۔اپنوں سے بچھڑنے کا غم تھا جبکہ دوسری ہجرت پردیس سے واپس لوٹنے کی تھی۔اس ہجرت میں ٹھکرائے جانے کا غم تھا۔9/11 کے بعد یہ کردار واپس اپنے دیس آ گئے ہیں لیکن اب اُن کی یادوں میں اُس پردیس کی یادیں ہیں، جہاں زندگی ایک معمول کے مطابق چلتی ہے۔اُس سرزمین کے باسیوں کو حادثات اور سانحات کا خوف نہیں رہتا۔اس لیے یہ کردار اب واپس وطن لوٹ کر اجنبیت کے تکلیف دِہ دور سے گزر رہے ہیں۔ان کے لیے دوبارہ انھی حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ممکن نہیں رہا۔

> یہ شہر وہی ہے، یہ شہر وہی نہیں ہے۔میں جس شہر میں آیا ہوں۔وہ بدلا ہوا ہے۔امریکہ میں کیمپس کی زندگی کے دن یاد آتے ہیں۔۔۔شاید میں ہوں ہی ایسا ایک جگہ بیٹھ کر کسی اور جگہ کو یاد کرنا، کیے چلے جانا۔۔۔ایک اور شہر یا اسی شہر کے کسی اور زمانے کے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔۔۔اس شہر میں آج ہی آج مر جانے کا اندیشہ گھل سا جاتا ہے۔[۲]

امریکہ سے واپس آنے والے ان لوگوں میں اپنی سرزمین اور اپنی مٹی سے دوری کا احساس شدت سے اُبھر کر سامنے آتا ہے۔افسانہ ''کھجور کا درخت'' کا واحد متکلم پاکستان واپس آنے کے بعد اپنی جڑوں کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔اس لیے جب وہ شہر میں کھجور کے درختوں کی افزائش ہوتے دیکھتا ہے تو اسے اپنا اور ان درختوں کا دکھ سانجھا محسوس ہوتا ہے۔ان درختوں کو جس بے دردی سے اپنی مٹی سے اُکھاڑ کر اجنبی سرزمین میں لگا دیا گیا ہے وہی درد، وطن

سے دوران باشندوں کا ہے جو معاشی مجبوریوں کے تحت اپناملک چھوڑتے ہیں۔ان کرداروں کا دکھ ان کی خود کلامی کے ذریعے بیان ہوا ہے۔

> درخت بالکل ساکن تھا۔اس کے پتے ٹاٹ میں لپٹے ہوئے تھے۔۔۔ جیسے آدھے سر کے درد میں لوگ پٹی کس کر باندھ لیتے ہیں۔۔۔ کیااس درخت کے بھی درد اُٹھا ہے؟ مجھے لگا کہ وہ درخت فریاد کر رہا ہے ایک چپ چاپ بے آواز سی فریاد۔۔۔ شکایت تو مجھے ہونا چاہیے۔۔۔اسے یہاں کس لیے لگایا گیا ہے؟اور کیا سوچ کر؟۔۔۔ یہ درخت یہاں کیوں منگوائے گئے ہیں؟اپنی مٹی سے اُکھاڑے گئے یہ درخت یہاں پنپ سکیں گے؟ یہاں کی آب وہواانھیں راس آجائے گی؟[۳]

واپسی کا یہ سفر آسان نہیں تھاتاہم وطن واپس آکر یہ کردار پرانی یادوں کے سہارے زندگی گزار رہے ہیں۔ بچھڑے ہوئے مقامات اور جگہوں سے مانوسیت ان کرداروں کو آسودگی فراہم کرتی ہے۔چنانچہ ان افسانوں کے کردار ان عمارتوں اور ستونون سے ہم کلام نظر آتے ہیں جن سے مدتوں پہلے یارانہ رہا ہے۔

اکیسویں صدی کا آغاز امنِ عالم کے حوالے سے نئے خدشات کا شاخسانہ ثابت ہوا۔امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے حادثے نے جہاں دہشت گردی جیسے مذموم عزائم کو ہوا دی وہیں ساری دنیا کے مسلمانوں کے کردار کو مشکوک بنا کر رکھ دیا۔بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو کر رہ گیا۔یوں صدیوں کی شناخت اور پہچان لمحوں میں ملیامیٹ ہوگئی۔۔ایسے حالات میں ان ممالک میں بسنے والے شہری ہر وقت ایک انجانے خوف اور ڈر سے دوچار نظر آتے ہیں۔

> بہ ظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہو تو لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔اب تو اور بھی کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔یوں ہی تو گزر نہ جائیں گے یہ خالی خولی دن۔ بادلوں کی طرح۔دیگر حالات بدستور،لیکن یہ تو بتاؤ کہ کیا تمھیں پورا یقین ہے کہ تم اپنے آپ میں سچے ہو؟وثوق سے کہہ سکتے ہو کہ اب بھی وہی ہو تم،اندر ہی اندر تبدیل نہیں کر دیے گئے؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ وقت ٹھیک ہے اور یہی جگہ،یہ تمہارے لیے اور تم ان کے لیے بالکل مناسب ہو؟[۴]

محمد حامد سراج کے افسانوں میں عہدِ حاضر کے انسان کی بدحالی،معاشرتی بدچلنی اور طاقت کے اندھا دھند استعمال پر گہرے افسوس کا اظہار ملتا ہے۔اکیسویں صدی کا آغاز جہاں دنیا کو نت نئی ایجادات اور سہولیات کی فراہمی کا جواز لے

کر آیا وہیں اس صدی میں عالمی سطح پر دہشت گردی اور ایٹمی قوت کے بے ہنگم استعمال سے انسانیت کی تباہی و بربادی کا پیغام بھی اپنے ساتھ لایا۔ چنانچہ دہشت گردی اور انسانی جانوں کا زیاں ہم پر ایک نئے خون آشوب دور کا عذاب مسلط کر رہا ہے۔ ایسے حالات میں ان کرداروں کی خود کلامی ذہنِ انسانی میں چھپے ان گوشوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو انھیں اپنے موجودہ حالات میں محصور کیے ہوئے ہے۔

> ہم صدیوں سے اندھیرے میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم اس بات سے بے خبر ہیں کہ سورج طلوع ہوتا ہے کہ نہیں؟ رات کو چاند چاندنی بکھیرتا ہے یا نہیں۔۔۔؟ ستاروں کی چادر آسمان پر تنی رہتی ہے یا نہیں۔۔۔؟ ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ جب ہماری بینائی چھن گئی تھی اس وقت کرۂ ارض ایٹم بم کی زد میں تھا، دنیا کے سات ممالک نے کامیاب ایٹمی دھماکے کر کے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔[۵]

اکیسویں صدی میں ایٹمی دھماکوں اور دہشت گردی کے عفریت کے ساتھ ساتھ چند ایسی مہلک امراض بھی تشخیص ہوئیں جن کے اثرات ہولناک ہونے کے ساتھ ساتھ جان لیوا بھی تھے۔ ان بیماریوں کا خوف انسانی آبادی میں عدم تحفظ اور بے چارگی کے احساس کو تقویت دے رہا ہے۔ یہ ایڈز اور کینسر کی امراض تھیں۔ اس لیے اس عہد کے کرداروں میں ان امراض کے حوالے سے خوف کی کیفیات غالب نظر آتی ہیں۔

> اکیسویں صدی میں ایڈز اور DNA کو تو دریافت کر لیا گیا تھا۔ لیکن ایڈز اور کینسر جیسے مہلک امراض کا علاج ابھی دریافت نہیں ہوا تھا۔ کلاننگ کے کامیاب تجربے کے بعد اس پر پابندی لگ چکی تھی۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے تجربے کے بعد بہت سی ماؤں کی گود ہری ہونے لگی تھی۔۔۔ بڑے ممالک اپنے مفادات کی خاطر چھوٹے ممالک پر چڑھ دوڑتے تھے اور دہشت گردی کے نام پر انھیں کچلنا اپنا حق سمجھتے تھے۔[۶]

حامد سراج کے کرداروں کی خود کلامی میں خود آگاہی اور خود شناسی کا کرب بھی نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔ یہ کردار جب خارج کی دنیا سے مُنہ موڑ کر داخل کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو انھیں اپنا آپ بھی متعفن اور زنگ آلود محسوس ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی قباحتیں اور برائیاں جن سے تنگ آ کر اس نے وجودیت کا سہارا لیا تھا وہ سب خود ان کی اپنی ذات میں سرایت کر چکی ہیں۔ چنانچہ خود آگاہی کا یہ لمحہ ایک عذاب کی صورت ان کرداروں پر مسلط ہو جاتا ہے اور وہ خود کو ان جھمیلوں سے بچا کر زندگی سے منہ موڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ کردار حالات کی نامساعدت سے شدید ذہنی تناؤ کا شکار

ہیں۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور بدامنی انھیں مسلسل ذہنی اذیت سے دوچار کیے رکھتی ہے۔ اس لیے ہونی اور ان ہونی کا خوف ان کرداروں کی خود کلامی میں ابھرتا محسوس ہوتا ہے۔ افسانہ ''ہے کوئی'' کا واحد متکلم گرد و پیش کے حالات سے تنگ آکر اخبار پڑھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہاں بھی اسے خیر کی کوئی خبر نہیں ملتی اور اسے اخبار میں بھی کیڑے رینگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

> دہشت گردی، خوف، گینگ ریپ، قتل۔۔۔ مسجد کے صحن میں نمازیوں کی لاشیں، بس اور ٹرین میں دھماکے، نسلی تعصبات۔۔۔ وہ سوچنے لگا لوگ اخبار کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں۔۔۔؟ اخبارات ہمیں کیا دے رہے ہیں، بے چینی، خوف و ہراس۔ مستقبل کے اندیشے، بے چینی کی فضا۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا۔۔۔؟ ایک کیڑا اخبار کی سطور میں رینگنے لگا۔۔۔ پھر اس نے لا تعداد کیڑے رینگتے دیکھے۔۔۔ اس کو دیواروں پر خوف رینگتا ہوا محسوس ہوا۔۔۔ دہشت اس کی رگوں میں بیٹھنے لگی۔ آخر میں جاؤں کہاں۔۔۔؟[7]

یہ دراصل اس کردار کا داخلی خلفشار ہے جو اسے ایسا سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ حامد سراج کے کرداروں کی خود کلامی میں حکمرانوں کی نااہلی اور ملکی حالات سے غداری کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ پاکستان کا موجودہ سیاسی نظام اس وقت جس غیر منظم صورتحال سے دوچار ہے اس کی وجہ سے عوامی طبقہ انتہائی بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ بنیادی سہولیات کا فقدان اور ایک عام آدمی کی زندگی کا بحران ان کرداروں کی خود کلامی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس عہد کے کرداروں میں نام نہاد معاشرتی معیارات کے خلاف ایک صدائے احتجاج اُبھرتی محسوس ہوتی ہے۔ سوشل اسٹیٹس اور بلند حسب نسب سے تعلق رکھنا ایک ایسا منفی رجحان ہے جو جدید عہد کے معاشرے میں ایک عام سی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ خصوصاً جاگیردارانہ نظام اور سیاسی پارٹیوں سے متعلق خاندانوں میں خود ستائی کا جذبہ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ان کی باہمی گفتگو اور بحث مباحثے کا محور بھی خود اپنی ہی ذات اور سوشل اسٹیٹس ہوتا ہے۔ افسانہ '' لوٹایا ہوا سوال'' کا واحد متکلم ایک باشعور اور معقول کردار ہے اس کا واسطہ تسبیح خانہ میں نساب سازی کرنے والے ایک شخص سے پڑتا ہے۔ اس شخص کی باتیں سُن کر واحد متکلم انسانی زندگی کی حقیقت اور معنویت پر غور کرنے لگتا ہے۔ واحد متکلم اس شخص کا نساب سنتے ہوئے بحیثیت مسلمان اپنے اصل نساب یعنی مدینے میں اسلامی معاشرے اور اسلامی اقدار سے نسبت کے بارے

میں سوچتا ہے اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر بحیثیت انسان اپنے اصل نساب یعنی روزِ ازل کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرتا ہے۔ یہاں اس کردار کے داخلی مکالمے میں ایک تاریخی تسلسل بھی چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

تخلیق کائنات سے پچاس ہزار سال پہلے اللہ نے روحوں سے سوال کیا تھا

الست بربکم؟

روحوں نے کہا

بلیٰ۔۔۔

یہ وہی تسلسل ہے۔ تسبیح خانہ تخلیق کائنات سے پچاس ہزار سال پہلے بھی موجود تھا، آج تم آئے ہو، کل کوئی اور آئے گا۔ اپنے آپ کو پہچان لو۔ اصحاب صفہ کے چبوترے سے اس تسبیح خانے تک کائنات کا تسلسل ہے۔ یہ منزلیں روح کی بقا کی علامت ہیں۔[۸]

ان کرداروں کے ہاں اپنے عہد کے سیاسی خلفشار خصوصاً فوجی آمریت، پابندیوں اور محبوس فضا کے خلاف غصے کا اظہار ملتا ہے۔ ایسے ماحول میں ان کرداروں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئی ہیں اور یہ کردار اپنے ماحول اور حالات کے آشوب کو اپنی ذات کے اندر سمیٹے ہوئے باطنی کرب سے دوچار ہیں۔

یہاں کوئی کیا محسوس کر سکتا ہے۔۔۔؟ حبس اور گھٹن میں محبوس شخص کیا سوچ سکتا ہے۔۔۔؟ کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔۔۔ ایسے ماحول میں انسان کی سوچیں اپاہج ہو جاتی ہیں۔ وہ ساری عمر اپنی لولی لنگڑی سوچ کو خوش فہمیوں کی لاٹھیوں پر چلاتا رہتا ہے۔۔۔ اور بس۔۔۔! ۔۔۔ میں کب تک دربدر بھٹکتا رہوں گا۔۔۔ میرا باطنی سکون کہاں کھو گیا ہے؟ ہر طرف کڑے پہرے ہیں۔ جاؤں تو جاؤں کہاں۔۔۔؟ کوئی دروازہ، کھڑکی، روزن، ہوا کا تازہ جھونکا۔۔۔؟[۹]

دہشت گردی اور انتہا پسندی کا عفریت اس صدی کے آغاز سے ہی پوری عالمی برادری کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ اس لیے ان کرداروں کی سوچ اور فکر میں تخریب کارانہ عناصر کے حوالے سے ایک خوف موجود رہتا ہے۔ افسانہ ''گھیراؤ'' کے کردار کی خود کلامی میں ہمہ وقت گولیوں کی سنسناہٹ سُنائی دیتی محسوس ہوتی ہے۔ گولیوں کی یہ سنسناہٹ دراصل اس دور کے انسانوں کے ذہنی انتشار کو واضح کرتی ہے جس کی وجہ سے یہ کردار پُرامن حالات میں رہتے ہوئے بھی مختلف خدشات اور اندیشوں کا شکار ہیں۔ عالمی سطح پر پٹرول اور تیل کے ذخائر پر مغربی طاقتوں کے تسلط

نے پوری دنیا کو معاشی عدم استحکام کے دھانے پر لا کھڑا کیا۔ مہنگائی اور اشیائے خورد نوش کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے ایک عام آدمی کے لیے جینا اجیرن کر کے رکھ دیا۔ اس افراطِ زر کا سب سے زیادہ اور شدید اثر تیسری دنیا کے ممالک پر پڑا۔ چنانچہ اس دور کے افسانوں کے کردار جب بیرونی حالات سے سمجھوتہ نہیں کر پاتے تو ان کا داخلی انتشار انھیں نفسیاتی عارضوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ ایک طرح سے ان کرداروں کے فراری رویے ہیں جو اُنھیں معاشی عدم استحکام سے نجات دلا کر آسودگی فراہم کرتے ہیں۔ افسانہ ''اندر'' کا کردار معاشی حالات کی نامساعدت کے باعث اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ افسانہ نگار نے اس کردار کے لاشعوری محرکات کو اس کردار کی بڑبڑاہٹ کی صورت میں بیان کیا ہے۔

> میری بیوی جھوٹ کہتی ہے۔ کچھ نہ کچھ ضرور ٹوٹا ہے۔ کوئی پیالی یا ڈنر سیٹ کی کوئی چیز۔۔۔ کتنی لاپرواہ ہے میری بیوی! کہیں یہ چھناکا میرے اندر تو نہیں ہوا؟ لیکن میرے سینے کے اندر ہے ہی کیا جو ٹوٹے گا اور اندر کے ٹوٹنے کی صدا باہر کب سُنائی دیتی ہے۔ یقیناً کچن میں کوئی چیز ٹوٹی ہے۔ میری بیوی چھپا رہی ہے۔ مجھے پھر چل کر دیکھنا چاہیے۔۔۔ میں پاگل ہو گیا ہوں، میری کھوپڑی گھوم گئی ہے۔ سب مجھے پاگل سمجھنے لگے ہو، میرے بے کار وجود کی اب اس گھر میں ضرورت ہی کیا ہے۔ [۱]

مشرف مبشر بھی اس دور کے اردو افسانے کی ایک نامور شخصیت ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار دہشت گردی اور بم دھماکوں سے متاثرہ کردار ہیں۔ دھماکوں سے بڑے پیمانے پر ہونے والی تباہی و بربادی اور اُجڑے گھروں کی ویرانی ان کرداروں کو مضمحل اور نڈھال کر رہی ہے۔ افسانہ ''نئی رات کا پیام'' کا کردار اُجڑے شہر کی گلیوں اور اس میں چلتے پھرتے نیم جان اجسام کی حالتِ زار پر سخت دلگیر ہے۔ اُسے اپنا شہر پہلے جیسا چاہیے۔ وہ شہر جس میں زندگی کی برقی رو چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ چنانچہ افسانہ نگار نے اس کردار کی شکست خوردگی کو اس کی خود کلامی کے ذریعے یوں بیان کیا ہے۔

> آگ و آہن نے میرے شہر کے جوانوں کو کیسے ریزہ ریزہ کر دیا چشمِ تصور نے ان ہولناک مناظر کی تباہ کاریاں دیکھیں تو روح کانپ اُٹھی میں دم بخود دیکھتا رِہ گیا۔ میرے شہر کے جوان ہسپتال میں موت کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ حسین چہرے بد ہیئت ہو گئے تھے۔۔۔ یا خدا میرے شہر کی عصمت کو محفوظ

رکھنا۔۔۔مرنے والوں کا ماتم کر کے صبر آ ہی جاتا ہے مگر جو جیتے جی بچھڑ جائیں ان کی جدائی کا دکھ بڑا کٹھن ہوتا ہے۔۔۔"[11]

ان کے افسانوں میں ایسے کرداروں کی قلبی حالتِ زار کو بیان کیا گیا ہے جو دہشت گردی کا شکار ہوئے یا جن کے عزیز و اقارب اس تباہی میں لقمۂ اجل بن گئے۔ان بچھڑے ہوئے لوگوں کی جدائی کا غم ان کرداروں کے لیے سوہانِ روح بن گیا ہے۔چنانچہ وہ زندگی میں کچھ حاصل کرنے اور آگے بڑھنے کی قوت سے محروم ہو گئے ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ کردار زندگی کے اس بکھرے ساز و سامان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ماضی کو بھول جانا اور اس سے ہی پیچھا چھڑانا ان کے بس سے باہر ہے تاہم زندہ رہنے کے کے لیے وہ خود ہی اپنے حالات سے سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

ہمت ہار دینا میرے لیے مناسب نہ تھا حالات کی سختیوں سے نبٹنے کے لیے مجھے اپنے آپ کو تیار کرنا تھا اگر میں مرد ہو کر بے ہمت ہو گیا تو مجھ سے وابستہ لوگوں کا کیا بنے گا میری ذمہ داریوں نے مجھے موت دے دی۔آہستہ آہستہ زندگی میں ٹھہراؤ آنے لگا۔۔۔۔کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔خوف و ہراس کے سنپولیے ہر سُو رینگتے نظر آتے تھے۔ہر سو وحشت سی تھی یہ سناٹا ویرانی کو بڑھاتا رہتا۔مجھے زندگی کی تلاش تھی۔مگر ہر سُو اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔"[12]

۹/۱۱ کے بعد افغانستان پر امریکی حملوں سے افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔پشاور اور اس کے گرد و نواح میں افغان مہاجرین کے لیے ریلیف کیمپوں کا انتظام کیا گیا۔اسی دور میں پاکستان میں شر پسند عناصر کی سرگرمیاں منظرِ عام پر آنے لگیں۔ایسے پُر تشدّد حالات کا ذمہ دار افغان مہاجرین کو ٹھہرایا گیا۔یہ دشمن عناصر کی جارحیانہ کارروایاں تھیں جنھوں نے بھائی بھائی کو دشمن بنا دیا۔ان حالات میں ان کرداروں کی گفتگو سے اس عہد کے فکری رویوں کا اظہار بھی ممکن ہوا ہے۔یہ غیر مسلم اقوام کی مسلم دشمن پالیسیاں تھیں جو اس وقت کامیاب ہو رہی ہیں۔ایسے سازشی ماحول میں باہمی منافرت کی جس فضا کو ہوا دی گئی اُس نے فرقہ واریت اور نسل پرستی کے رجحانات کو تقویت دی۔جس کے نتیجے میں صدیوں سے ایک ہی جگہ مل کر رہنے والے ایک دوسرے کے مدّمقابل آ کھڑے ہوئے۔ مسلم ممالک کی سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے صوبائی تعصبات اور شیعہ وسُنی فرقوں کو باہم دست و گریباں کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ مشرف مبشر کے افسانوں کے کردار گہرے سماجی شعور کے حامل نظر آتے ہیں

۔اس لیے ان کرداروں میں ان نسلی و لسانی اختلافات اور فرقہ واریت کی فضا کے خلاف ایک واضح فکر اُبھرتی نظر آتی ہے۔

یہ بستی کسی ایک قبیلے اور ایک گروہ کی نہ تھی۔ یہاں تو بہت سے قبیلے اور خاندان مل جُل کر رہ رہے تھے،ان میں کوئی آغا تھا تو کوئی مرزا،کچھ سُنے تھے اور کچھ شیعہ یہاں سیّد بھی رہ رہے تھے اور اعوان بھی ،پابندِ شریعت بھی یہیں تھے اور بے نیاز شریعت بھی یہ بستی مسلمانوں کی تھی پاکستان کی سرزمین کا یہ قطعہ پاکستانیوں کا تھا یہاں تو صرف مسلمان اور پاکستانی آباد تھے پھر یہ آگ کیسی؟ یہ بربادی کیا معنی رکھتی ہے؟ اس کا جواب کون دے۔[۱۳]

۹/۱۱ کے بعد افغانستان میں امریکی تسلط کی وجہ سے افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے پاکستان آگئی۔ان مہاجرین میں وطن سے دوری کا احساس شدید نظر آتا ہے۔ مشرف مبشر کے کرداروں میں افغان مہاجرین کی بے گھری اور مہاجرت کا کرب واضح طور سے جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔یہ کردار ماضی کی حسین یادوں میں کھو کر اپنی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ماضی کی یہ بازیافت انھیں ہر لمحہ عدم تحفظ کے احساس سے دوچار کیے رکھتی ہے۔افسانہ ''قربانی'' کی امینہ بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جس کا پورا خاندان افغانستان سے ہجرت کر کے پشاور کے نواحی علاقے میں پناہ گزیں ہے۔یہ کردار ماضی کی یادوں میں کھو کر خود اذیتی کے کرب سے دوچار نظر آتا ہے۔

وہ سوچ رہی تھی۔وقت کس قدر بے رحم ہے ہم کتنے مجبور ہیں گزرتے وقت کا ایک لمحہ بھی تو اپنا نہیں رہا آنے والا وقت کس رنگ میں آئے گا کون جانے؟وقت پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہم اس کے دھارے میں بہنے والے کمزور تنکے کی حیثیت رکھتے ہیں آج کا وقت اب بھی اپنا ہے اسی کو غنیمت سمجھو کیا پتا کل یہ بھی اپنا نہ رہے تو۔[۱۴]

چنانچہ ان حالات میں امینہ نفسیاتی طور پر عدم تحفظ اور خوف کی کیفیت سے دوچار ہے۔بدلتے حالات نے اسے جس بے گھری کے عذاب سے دوچار کیا ہے اس کی وجہ سے اس کا مستقبل مختلف اندیشوں کی زد میں ہے۔اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ایسے بندھن کو قبول کرنے پر تیار ہو جاتی ہے جو ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے لیے قابلِ قبول نہیں۔

آنے والے نامعلوم وقت کے خوف سے آمینہ نے اپنی آخری پناہ گاہ قبول کر لی تھی اس لمحے اس کا ذہن ایک بار پھر اپنے وطن اور دلبر خان کی طرف پلٹ رہا تھا۔۔۔ ستم گر وقت نے اس کے خواب اس سے چھین لیے تھے آنے والے وقت سے وہ بے خبر تھی۔ آج کے لمحے کو گنوا کر وہ بالکل بے سہارا ہو جائے گی وہ وقت کی بے مہری سے خوفزدہ تھی۔[۱۵]

افتخار جمیل نسیم کے افسانوں میں بھی نائن الیون کے بعد کی سیاسی و سماجی صورتحال کا بیان ملتا ہے۔ان کا افسانہ ''پردیسی'' اسی تناظر میں لکھا گیا ہے۔اس افسانے کا کردار ایک ایسا شخص ہے جو اپنی کھوئی ہوئی شناخت کے حصول میں محو ہے۔یہ کردار ابتداء سے ہی منتشر صورتحال سے دوچار رہا ہے۔۱۹۴۷ء کے فسادات میں یہ بچہ اپنے اہل وعیال سے بچھڑ جاتا ہے اور پھر ایک مسلم خاندان کا حصہ بن جاتا ہے۔لیکن یہاں بھی ہر لمحہ اس کی شناخت مشکوک رہتی ہے۔نائن الیون کے سانحے کے بعد اس کا وجود ایک بار پھر سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔اس لمحے اس کردار کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ساری زندگی پردیسی ہی رہا ہے۔افسانہ نگار نے اس کردار کی شکست خوردگی کو خود کلامی کے پیرائے میں اس طرح سے بیان کیا ہے۔

چالیس سال بعد وہ امریکہ میں شکاگو کی ایک ہائی رائز بلڈنگ کی پینتالیسویں منزل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا سوچ رہا تھا کہ وہ کس دُنیا کا باسی ہے۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی میں اس کا ہاتھ نہیں مگر اس کے رنگ و نسل کے سب لوگوں کو مجرم گردانا جارہا ہے اور ڈانٹا جارہا ہے کہ گو بیک ٹو یور کنٹری Go back to your country،آخر اس کا ملک کون سا ہے؟اس کا وطن کہاں ہے؟وہ کس گھر کا باسی ہے؟کیا ۱۹۴۷ء کبھی ختم بھی ہوگا کہ نہیں؟[۱۶]

یہ خود کلامی عدم شناخت اور بے زمینی کا اشارہ ہے۔یہ کردار ابتداء سے ہی دربدری اور بے گھری کے المیے سے دوچار رہا ہے لیکن نائن الیون کے بعد کی صورتحال میں اس کی تلاش شدید تر ہو جاتی ہے۔یہ موضوع ایک طرح سے عالمی سیاست کو بے نقاب کر رہا ہے کہ طاقت ور جب چاہتا ہے کمزور کی حیثیت کو چیلنج کر کے اسے اس کی جگہ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔یہ کمزور اور بے بس طبقہ بالادست طبقے کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہے۔

''بگ برادر''سب جگہ کا ایک ہی ہے؟امریکہ جو دنیا بھر کا بگ برادر بنا ہوا ہے۔اس کا رویّہ بھی اس کے اپنے بگ برادر کی طرح آمرانہ کیوں؟کیا ہم سب پیدا ہوتے ہی اپنی ماں باپ سے بچھڑ گئے تھے۔وہ کون

سی دنیا ہے جہاں کوئی رنگ، نسل، مذہب کی دیوار نہیں ہے؟اب میں یہاں سے کہاں جاؤں؟آگے تو زمین ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کیا پوری تھرڈ ورلڈ یتیم خانہ ہے؟"[۱۷]

سلطان جمیل نسیم کے افسانوں میں نائن الیون کے بعد کے اثرات کا ذکر ایک مختلف انداز سے کیا گیا ہے۔۔ان کے کرداروں کی سوچ دراصل ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ دہشت گردی کا نشانہ چاہے کوئی بھی مسلک، علاقہ یا افراد ہوں لیکن مقاصد ایک ہی ہیں۔ یہ انسانیت سوز سرگرمیاں نسلی اور گروہی اختلافات کو ہوا دیتی ہیں۔اس افسانے میں سب سے متاثر کن بات یہ ہے کہ تینوں ممالک میں دہشت گردی سے متاثر ایک شخص ہو رہا ہے۔

دیا بھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ۱۱ ستمبر کو بنیاد بنا کر دہشت گردی کے خلاف سارے دہشت گرد اکٹھے ہو گئے۔۔۔احمد آباد میں میری بہن رہتی تھیں۔ وہاں فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں نے مجھے بے کل کر دیااُن کی خیر خبر کیسے معلوم کی جائے سرحدوں پر فوجیں سرگرم عمل ۔۔۔۔ یہاں پاکستان میں بھی فقہی، سیاسی اور لسانی اختلافات پر قتل ہوتے رہتے ہیں۔۔۔۔ قاتل یہ نہیں دیکھتے قصوروار کون ہے۔بس اُن کو تو روبوٹ کی طرح حکم بجالانا ہوتا ہے۔ عبادت گاہیں تک محفوظ نہیں۔۔۔[۱۸]

جمیل نسیم کے کرداروں میں ہمہ وقت ایک بے یقینی اور عدم اطمینان کی کیفیت غالب نظر آتی ہے۔ یہ بے یقینی دراصل حالات کی نامساعدت اور بے سمتی کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ یہ کردار بیک وقت کچھ پالینے اور کھو دینے کی کیفیات کے درمیان معلق نظر آتے ہیں۔ یہ کردار گمان کی حد تک بے یقینی کا شکار ہیں۔اس لیے انھیں اپنا وجود ہونے اور نہ ہونے کی کیفیات کے درمیان معلق نظر آتا ہے۔اس افسانے کا کردار بھی لمحاتی زیروبم کا اسیر ہے جس کی وجہ سے اُسے اپنا ماضی اور حال دونوں ایک شکنجے میں جکڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ایسی صورت میں اس کے لیے کسی بھی نئی چیز کے بارے میں سوچنا ممکن نہیں رہتا۔ سلطان جمیل نسیم کے افسانوں میں معاشرے میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی خصوصاً گن پوائنٹ پر لوٹ مار اور ٹارگٹ کلنگ جیسے واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے۔اس لیے اس دور کے افسانے میں ایسے مشکوک کرداروں کی سرگرمیاں بھی منظر عام پر آتی ہیں جو تخریب کارانہ جرائم میں ملوث ہیں۔افسانہ ''بے اختیار''کا واحد متکلم ایک ایسا کردار ہے جو ڈکیتی کی وارداتوں میں ملوث ہے۔ چوری، ڈاکہ اور نقب زنی اس کا پیشہ ہے اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کردار کو اپنے پیشے سے محبت بھی ہے۔ جس کا اظہار اس کے داخلی مکالموں کے ذریعے ہوتا ہے۔

میں نے سوچا اگر وہ شام تک نہیں نکلا تو کیا میں الو کی طرح بیٹھا اس کے دفتر کی کھڑکی کو تکتا رہوں گا؟ پھر خود کو سمجھایا کہ میں کوئی سرکاری ملازمت تھوڑی کر رہا ہوں جو اپنے کام سے بیزار ہونے لگا۔۔۔۔یہ پیشہ تو میری محبت ہے اور میں اس محبت کا اسیر ہوں۔۔۔نشے کی طرح لت پڑ گئی ہے۔یہ وقت جو اس کی راہ تکتے گزر رہا ہے یہ بھی اس نشے کا سودا ہے۔[۱۹]

افسانے کے اختتام پر واحد متکلم ڈکیتی کی ایک واردات میں نوبیاہتا جوڑے کو ہراساں کیے ہوئے ہے۔اس موقعے پر زیرِ حراست افراد اور ان کے لواحقین کی بے بسی کو دیکھ کر یہ کردار خود کو بااختیار اور پُر اثر تصور کرنے لگتا ہے۔طاقت کا نشہ اور کمزور کو زیر کر لینے کا لطف اُس کے لیے نا قابل بیان ہے۔اس موقعے پر اس کردار کی ذہنی کیفیات اس کی خود کلامی کے ذریعے بیان ہوتی ہیں۔

ایک لمحہ وہ تھا جس نے میرے جود میں غصے کی آگ اور انتقام کا شعلہ بھڑکا یا تھا اور پھر دوسرا لمحہ وہ تھا جو سانپ کے پھن کی مانند اُٹھا اور زہر کے مانند مجھ میں پھیل گیا۔۔۔میں نے ان تینوں کی صورتیں دیکھیں ۔۔۔زندگی کا اُڑا ہوا رنگ امید و بیم کی پرچھائیوں میں لت پت زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے ملتجی چہروں کے کشکول مجھے ایسا لگا جیسے سب کچھ میرے اختیار میں ہے جیسے میں ان کو زندگی بھی دے سکتا ہوں۔جیسے میں ان کے سانس کی ڈوری ہاتھ میں تھامے ہوئے چاقو سے جب چاہیں کاٹ سکتا ہوں۔[۲۰]

مختارِ کل بننے کا جذبہ اور کسی کمزور کو گرا دینے اور شکست دینے کا جنون ایک احساسِ تفاخر کی صورت میں اس کردار کی خود کلامی سے جھلکتا ہے۔یہ انسانیت دری اور بے رحمی کی انتہائی صورت ہے کہ انسان خود کو اعلیٰ و ارفع مخلوق سمجھتے ہوئے باقی انسانوں کو کچل دینے کا شوق رکھتا ہے۔طاقت کا یہ نشہ معمولی سے معمولی انسان کو بھی احساسِ برتری میں مبتلا کر دیتا ہے اور پھر باقی مخلوق کو کمتر اور حقیر سمجھنے لگتا ہے۔

مبین مرزا کے افسانوں میں ملک کی بدلتی صورتحال خصوصاً دہشت گردی کے عفریت سے پھیلتی بدامنی اور خوف و ہراس کی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔افسانہ ’’خوف کے آسمان تلے‘‘ میں کراچی شہر کی ابتری اور اس کے مکینوں میں ہراسیت اور ڈر کی کیفیات کو گرفت میں لیا گیا ہے جو آئے دن کی پکڑ دھکڑ، ایذار سانی و تشدد، فائرنگ اور بمباری کی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا۔ایسے حالات میں اس افسانے کا واحد متکلم متزلزل ذہنی کیفیات کا شکار ہے۔سنسنی خیزی اور

سراسیمگی کی کیفیت میں اُسے اپنا وجود ریزہ ریزہ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔افسانہ نگار نے اس کردار کے داخلی ہیجان کو خود کلامی کے ذریعے بیان کیا ہے۔

> انھیں اندر سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں خلا میں معلق ہوں۔زمین پاؤں تلے سے غائب ہو چکی تھی،بس سر پہ ایک آسمان بنا ہوا تھا۔۔۔خوف کا آسمان۔۔۔جس کے نیچے ان کا دم گھٹ رہا تھا۔۔۔ہر بار کوشش کے بعد ان کے خوف اور ہیجان میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔[۲۱]

ملک میں بڑھتے ہوئے تشدّد کے واقعات ان کرداروں میں خوف کو تحریک دے رہے ہیں۔دن رات گرنے والی لاشیں اب حادثہ معلوم نہیں ہوتیں بلکہ یہ معمول کا حصہ بن چکا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قتل و غارت گری ایک سیاسی ہتھکنڈہ نہیں بلکہ معاشرتی بیماری بن گیا ہے جو تھرل اور حظ کا ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔افسانے میں کراچی شہر میں ہونے والی خون ریزی کو موضوع بناتے ہوئے دراصل اس جبر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو پورے ملک کی فضاؤں پر طاری ہے۔

> وحشیوں کا درندوں کا شہر ہو چکا ہے کراچی،انسان نہیں بستے یہاں۔انسان ایک دوسرے کے ساتھ نہیں کر سکتے یہ سب کچھ۔۔۔یہ بربریت۔۔۔یہ سفاکی۔۔۔بالکل غیر انسانی صورتحال۔۔۔نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔سب کے چہروں پر خوف اور اضطراب تھا۔نہیں،یہ سب تو انسان ہیں۔۔۔۔ان میں تو کوئی درندہ نہیں ہے۔۔۔اور وہ لوگ جنھوں نے دروازے کھول کھول کر موت سے بھاگے ہوئے ان بے اماں لوگوں کو پناہ دی ہے۔۔۔نہیں،بالکل نہیں،انسانیت اس شہر سے بالکل ختم نہیں ہوئی۔یہاں اکثریت انسانوں ہی کی ہے لیکن یہ اکثریت درندوں کی اقلیت کے آگے بے بس ہے۔[۲۲]

ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کا اصل ذمہ دار حکمران طبقہ ہے جنھوں نے ۹/۱۱ کے بعد امریکہ کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے فسٹ لائن اتحادیوں کا کردار ادا کیا۔پاکستان کے اس نئے کردار نے یہاں کے باشندوں کو نئی آزمائش سے دوچار کر دیا۔آئے روز کے بم دھماکے اور خود کش حملے ایک روٹین بن کر رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے ایک عام آدمی شدید قسم کے نفسیاتی امراض کا شکار ہو رہا ہے۔اس افسانے کا واحد متکلم اس نئی صورتحال سے سخت پریشان ہے۔بے یقینی اور عدم تحفظ نے اسے خوف کے دائروں تک محیط کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ عدم تحفظ کا شکار ہو رہا

ہے۔

نائن الیون کے حوالے سے اس عہد کے کرداروں کی خود کلامی میں غالب موضوع جلاوطنی اور امریکہ بدری کا ہے۔اس المناک سانحے نے پوری دنیامیں مُقیم پاکستانیوں کے کردار کو مشکوک بنا کر رکھ دیا۔صدیوں کی بنی بنائی ساکھ منٹوں میں بکھر کر رہ گئی۔۔ان میں سے پیشتر کردار ایشیائی ہیں اس لیے اپنے ملک واپس آنے کے بعد بھی بے چین ہیں ۔نہ وہاں کا سماجی نظام انھیں قبول کرنے پر تیار ہے اور نہ اپنے ملک میں ان لوگوں کے لیے کوئی جگہ ہے۔اس لیے یہ کردار بیک وقت جلاوطنی اور اجنبیت کے احساس سے دوچار ہیں۔اس اجنبیت اور بے گھری کا احساس ان کرداروں کی خود کلامی میں ہوتا ہے۔فرد کی نفسیاتی کیفیات کا بیان دراصل اس عصری تناظر کا بیان ہے جس میں رہتے ہوئے ہر شخص ایک انجانے ڈر، خوف،اور بے اطمینانی کی کیفیت سے دوچار نظر آتا ہے۔اس صورتحال میں اردو افسانہ ان اثرات سے شعوری اور لاشعوری طور پر متاثر نظر آتا ہے۔ان تمام نفسیاتی وذہنی رویوں کی وجہ سے اس عہد کے کردار خود کلامی، ہم کلامی اور آزاد تلازمہ خیال کی صورت میں اپنی داخلی کیفیات کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۵۴

۲۔ ایضاً ص ۵۵

۳۔ ص ۷۲

۴۔ آصف فرخی، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۷ء، ایضاً، ص ۳۸

۵۔ حامد سراج، محمد، وقت کی فصیل، آفاق پبلشرز، راولپنڈی، س ن، ص ۱۱

۶۔ ایضاً ص ۱۱

۷۔ ایضاً ص ۳۳

۸۔ ایضاً ص ۱۲۳

۹۔ ایضاً ص ۱۴۷

۱۰۔ ایضاً ص ۱۴۱،۱۴۲

۱۱۔ مشرف مبشر، برکھا کی بدلی، دستاویز، مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۸۱

۱۲۔ ایضاً ص ۸۴

۱۳۔ ایضاً ص ۵۲

۱۴۔ ایضاً ص ۷۷

۱۵۔ ایضاً ص ۷۷

۱۶۔ افتخار نسیم، پردیسی، مشمولہ :9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ، از نجیبہ عارف (مرتب)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۹

۱۷۔ ایضاً ۱۱۰

۱۸۔ سلطان جمیل نسیم، کشمکش، مشمولہ: فنون-۱۲۵ (مدیر: احمد ندیم قاسمی)، لاہور، جنوری تا اپریل ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۶

۱۹۔ اے خیام/زاہد رشید (مرتبین)، ہم عصر اردو افسانہ، ظفر اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۰۲

۲۰۔ ایضاً ص ۲۱۰

۲۱۔ اے خیام/زاہد رشید (مرتبین)، ہم عصر اردو افسانہ، ظفر اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۵۶

۲۲۔ ایضاً ص ۳۴۶،۳۴۷